

سچا کراچی

05-25-2017



پیارے بچے



فہرست

بچوں کی دنیا

۱. تین دوست.....

مشور شخصیات

۳. نیولین.....

معاشرہ و ثقافت

۴. انگلش و نگلش.....

۶. انوکھی سزا.....

۷. سوشل میڈیا کے دانشور.....

۸. عورت.....

میں آتا مجھے نہیں گرا سکتے تھے۔“

”میں بے کار میں نہیں ڈر رہا ہوں۔ بل کہ صحیح معنوں میں ڈر رہا ہوں۔“ چھد کو نے کہا اور پھر سرگوشی کے انداز میں چپیں چو کو بولنے لگا کہ: ”میں تو کہوں گا کہ اب تم بھی اُس کے ساتھ کھیلتا چھوڑ دو۔ نہیں تو وہ کسی دن تمہیں بھی ضرور دھوکا دے گا۔ اور تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

”یہ سب سراسر غلط ہے۔“ چپیں چو بولی۔

”غلط بات نہیں ہے۔“ چھد کو نے بات کاٹی اور آگے بولا: ”کیا بلی اور کتے کی کبھی دوستی رہ سکتی ہے۔ بلی کتے کو دیکھ کر ہمیشہ ڈرتی رہی ہے۔ کوئی وجہ ہوگی تب ہی تو بلی کتے سے ڈرتی ہے۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے یہ نصیحت کی ہے اب تمہاری مرضی تمہیں اس کے ساتھ کھیلتا ہے کیلو یا مت کیلو۔ لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا۔“ چھد کو نے پھر سے یہ بات دہرائی کہ: ”وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“



”یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بلی اور کتے کی کبھی نہیں نصیحتی لیکن یہ سب کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں۔“ چپیں چو نے چھد کو سے کہا۔

”اچھا! دوسری مثال بھی سنو۔“ چھد کو بولا: ”شیر اور ہرن میں کبھی دوستی نہیں سنی گئی۔ جب بھی شیر ہرن کو دیکھتا ہے، وہ اس کو مارنے دوڑتا ہے۔ اگر پکڑ لیتا ہے تو وہ ہرن کو مار ہی ڈالتا ہے۔ اس لیے شیر ہرن کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ اسی طرح بلی اور کتے کا معاملہ ہے۔“

”میں تمہاری اس بات سے اختلاف نہیں کرتی۔“ چپیں چو نے کہا اور بولی: ”بل کہ میں ایک مثال اور دیتی ہوں، وہ بھی کسی دوسرے کی نہیں خود اپنی یعنی بلی اور چوہے کی۔ بلی چوہے کی دشمن ہے، وہ جہاں کہیں چوہے کو دیکھتی ہے اس کو مار ڈالتی ہے۔ لیکن کہیں بلی اور چوہے کی دوستی ہوئی ہے؟ میری اور تو تو کی دوستی کی بات الگ ہے۔“

اس کے بعد تو تو کہیں سے گیند اٹھا لایا۔ دونوں کچھ دیر گیند سے کھیلتے رہے۔

شام ہو رہی تھی۔ تو تو بولا: ”چپیں چو! اب میں گھر جاؤں گا۔ آج تو کھیلتے کھیلتے تھک گیا ہوں۔ ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ آج وہ کچھ دیر بعد مجھے کہیں گھمانے لے جائیں گی۔“

”تو جلدی جاؤ!“ چپیں چو بولی۔ ”میں بھی تھک گئی ہوں۔ لیکن کل مجھے ضرور بتانا کہ تم کہاں گھومنے گئے تھے۔“ وہ پھر بولی۔ ”کل میری ماں مجھے کچھ نئی چیز کھانے کو دینے والی ہیں مگر مجھے بتایا نہیں ہے۔ دیکھیں کیا دیتی ہیں؟“

تو تو اپنے گھر چل دیا اور چپیں چو اپنے گھر۔ دونوں کو الگ الگ سمت جانا تھا۔

جب چپیں چو اپنے گھر جا رہی تھی۔ راستے میں چھد کو بندر ملا۔ وہ درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا۔ چپیں چو کو دیکھتے ہی شاخ پر سے بولا: ”کھو کھو... کھو کھو۔“

چپیں چو سمجھ گئی کہ یہ چھد کو بندر ہے۔

”ارے بھئی! کیا حال ہے؟ نیچے تو آؤ۔“ چپیں چو بولی۔ ”کچھ کہنا ہے کیا؟“

”کہنا تو ہے لیکن نہیں کہوں گا۔ آج کل تو تم تو تو کے ساتھ زیادہ کھیلتی ہو۔ میں تو درخت کی شاخ پر اکیلا بیٹھا رہتا ہوں، تم کو تو میرا خیال ہی نہیں رہتا۔“ چھد کو نے شکایت کی۔

”تو تم بھی کھیلا کرو ہمارے ساتھ، بڑے برگد کے پاس آجایا کرو۔ وہیں تو تو آتا ہے ہم تینوں مل جل کر کھیلا کریں گے۔“ چپیں چو نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”ہااا... ہااا... ہااا...“ چھد کو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: ”میں تو۔ تو تو کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ نہ جانے کب وہ مجھے کاٹ لے؟ جب وہ جھوکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بالوں گرج رہا ہو۔ مجھے تو اُس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”تم بے کار میں تو تو سے ڈر رہے ہو۔“ چپیں چو بولی۔

تین دوست

مصنف: حاجی بصیر سراج

چپیں چو بلی اور تو تو کتا مل کر کھیل رہے تھے۔ چپیں چو نے تو تو کو دھکا مارا۔ تو تو گر پڑا۔ چپیں چو تالی بجانے لگی۔ ”گرا دیا، ... گرا دیا...“



تو تو اٹھ گیا۔ اس پر تھوڑی مٹی لگ گئی تھی۔ اس نے مٹی جھاڑی اور چپیں چو سے بولا: ”میں گراؤں تو کہنا مت کہ گرا دیا۔“ ایسا دھکا ماروں گا کہ تم لڑھکتی چلی جاؤ گی۔“

”تم گرا ہی نہیں سکتے۔“ چپیں چو ہنسنے لگی۔

”اچھا...“..... ”ہاں!“

”تو تیار ہو جاؤ۔“..... چپیں چو پہنچے گڑا کر کھڑی ہو گئی۔

تو تو جانتا تھا کہ چپیں چو پہنچے گڑا کر کھڑی ہو جائے گی اور وہ اسے گرانہیں پائے گا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس آیا اور دھکا مارا۔ چپیں چو ذرا سی ڈمگ کر رہ گئی۔

تم میں تو بہت طاقت ہے۔ میں سچ سچ تم کو نہیں گرا پایا۔“ تو تو بولا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“ اتنا کہہ کر چپیں چو آرام سے کھڑی ہو گئی۔ تو تو ہوشیاری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور تیزی سے آکر ایک دھکا مارا۔ چپیں چو زور سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔ اب تالی بجانے کی جاری تو تو کی تھی وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

چپیں چو اور تو تو دونوں بہت کھلڑے تھے وہ دونوں اس وقت مذاق ہی تو کر رہے تھے۔ چپیں چو کھڑی ہو گئی۔ اس نے بھی اپنے جسم پر لگی دھول مٹی جھاڑی اور بولی: ”ایسا دھکا دینے سے کیا ہوتا ہے؟ ذرا پہلے ہی بول کر دیتے تو سمجھ

اب بھدکو خود ہی بولا: ”میں نے ایک دن چیں چو سے کہا تھا کہ تو تو تمہیں کسی دن دھوکا دے گا، اُس کا ساتھ چھوڑ دو۔“

تو تو ہنسا: ”بس اتنی سی بات، اس کے لیے معافی مت مانگو۔ تمہارے دل میں شک تھا سو وہ آج دور ہو گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

تو تو کتنے نے نے بھدکو بندر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھدکو بندر کا ہاتھ چیں چو بلی نے پکڑ لیا اور تینوں کہتے جارہے تھے ہم تینوں دوست ہیں۔

§§§

دوسرے لڑکے نے کہا۔ اُن لڑکوں کی باتیں چیں چو نے بھی سنا اور تو تو نے بھی۔ تو تو بولا: ”چیں چو! تم نہیں رہو۔ میں اُن لڑکوں کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ یہ جیسے ہی غلیل چلانے جائیں گے۔ میں اتنی زور سے بھونکوں گا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ اپنی بھون بھون سے میں انھیں ایسا ڈراؤں گا کہ پھر کبھی بھی وہ اوھر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن میں بھی اتنی ہوں۔ تم جا کر اُن لڑکوں کو ڈراؤ۔“ چیں چو نے کہا۔

لڑکے جلدی سے درخت کے پاس پہنچے۔ ایک لڑکے نے کہا: ”دیکھو میرا نشانہ کتنا صحیح ہے میں غلیل چلاؤں گا تو میرا ڈھیلا سیدھا بندر کے سر پر لگے گا۔“

تو تو کے قریب آکر چیں چو بھی کھڑی ہو گئی۔ بھدکو بندر درخت پر سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کو غلیل مارنے والا ہے۔ اُس نے سوچ لیا کہ جیسے ہی وہ لڑکا غلیل چلائے گا وہ چھلانگ لگا کر دوسری شاخ پر چلا جائے گا۔

لڑکے نے جیسے ہی غلیل سے نشانہ لگایا۔ تو تو نے ایسی زور سے بھون بھون بھونکا کہ وہ بُری طرح ڈر گئے اور غلیل وہیں پھینک کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ بھدکو نے دیکھا کہ لڑکے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو تو تو نے ڈرا کر بھگایا ہے۔

اب بھدکو بڑا شرمندہ ہوا۔ کہیں ڈھیلا اسے لگ جاتا تو؟ تو تو نے شرارتی لڑکوں کو بھگا کر اُس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

بھدکو شاخ سے کود کر نیچے آیا اور تو تو سے بولا: ”بھیا! مجھے معاف کر دینا۔“

”کس بات کے لیے؟“ تو تو نے انھیں بن کر پوچھا۔ ”کیا چیں چو دیدی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ بھدکو نے کہا۔

”نہیں مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔“ تو تو بولا اور چیں چو سے پوچھا: ”کیا بات ہے چیں چو؟“

”کچھ نہیں کوئی بات نہیں ہے۔“ چیں چو بولی۔ وہ تو تو کو کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں بھدکو اور تو تو میں دراڑ پڑ جائے۔

”میں نے جو سمجھا وہ تمہیں بتا دیا۔“ بھدکو بولا۔ ”تم میری اچھی دوست ہو۔ اس لیے تم کو بتا دیا، نصیحت کر دی، اب تمہاری مرضی تم میری بات مانو یا نہ مانو، لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا۔“ بھدکو نے پر سے یہ بات دہرائی کہ: ”وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

چیں چو کو بھدکو کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ یہ تو کسی کی برائی بیان کرنا ہوا، غیبت کرنا ہوا۔ برائی اور غیبت تو دشمن کی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ غیبت کرنا یا کسی کی دوستی کو توڑنا یا کسی میں جھگڑا لگوانا اچھی بات نہیں ہے بل کہ یہ تو سب سے بڑا دھوکا ہے۔ اُس نے یہ باتیں بھدکو سے نہ کہی بل کہ من ہی من میں سوچتے ہوئے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔



چیں چو اور تو تو ہمیشہ کی طرح کھیلتے رہے، ہنستے بولتے، گاتے رہے۔ چیں چو روز بھدکو کو کھیلنے کے لیے بلاتی رہی لیکن وہ بار بار بلانے کے باوجود بھی کبھی ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ تو تو اُسے کاٹ لے گا، وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ بل کہ وہ چیں چو سے اکثر کہتا کہ: ”وہ کسی دن تمہیں دھوکا دے سکتا ہے وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

وقت گذرتا رہا کہ ایک دن جھاڑی کے قریب سے چند لڑکے جارہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں غلیلیں تھیں، وہ صورت شکل سے ہی بڑے شرارتی لگ رہے تھے۔ چیں چو اور تو تو جہاں کھیل رہے تھے وہ لڑکے وہیں سے گذرے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا: ”میرا نشانہ ایسا پکا ہے کہ جس کو غلیل ماروں وہ بچ ہی نہیں سکتا۔ میں اڑتے ہوئے پرندے کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔“

”تو چلیں بندر کو غلیل ماریں۔“ ایک لڑکے نے کہا۔ ”وہ دیکھو! بندر شاخ پر بیٹھا ہے۔“

”ہاں دیکھیں! کس کا نشانہ صحیح بیٹھا ہے؟“ ایک

نپولین

مصنف: اسد احمد

یہ اُس دور کی بات ہے جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تھا۔ اُس کے فوجی دستے ایک اور جھوٹے سے قصبے میں جنگ میں مصروف تھے۔ اتفاق سے نپولین اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا۔ کاسک فوج کے ایک دستے نے نپولین کو پہچان لیا اور شہر کی پُرجھج گلیوں میں اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ نپولین اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتا ہوا ایک بگلی گلی میں واقع ایک سمور فروش کی دکان میں جا گھسا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد جوں ہی اُس کی نگاہ سمور فروش پر پڑی وہ بے چارگی سے کراہتے ہوئے بولا ”مجھے بچالو! مجھے بچالو! مجھے کہیں چھپا دو۔“ سمور فروش بولا ”جلدی کرو! اُس گوشے میں سمور کے ڈھیر کے اندر چھپ جاؤ!“ پھر اُس نے نپولین کے اوپر اور بہت سے سمور ڈال دیے۔



ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کاسک فوجی دستہ دندناتا ہوا اُس کی دکان میں آگھسا اور فوجی چیختے لگے ”وہ کہاں ہے؟“ ”ہم نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھا ہے؟“ سمور فروش کے احتجاج کے باوجود اُن فوجیوں نے سمور فروش کی دکان الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ نپولین کی تلاش میں انھوں نے دکان کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ اپنی تلواروں کی نوکوں سمور کے ڈھیر میں گھساتے رہے لیکن نپولین کو تلاش نہ کر پائے۔ بالآخر انھوں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور واپس چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب سکون ہو گیا تو نپولین سمور کے ڈھیر میں سے ریگتا ہوا باہر نکل آیا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔

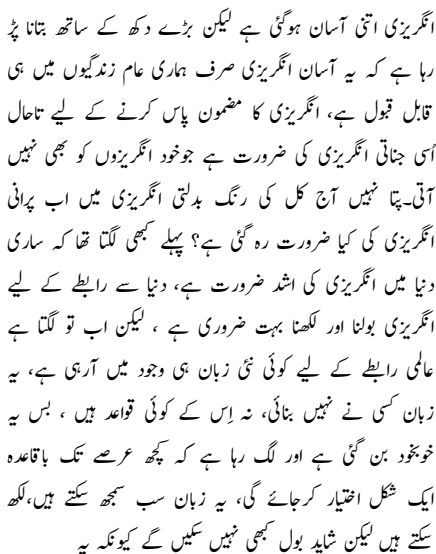
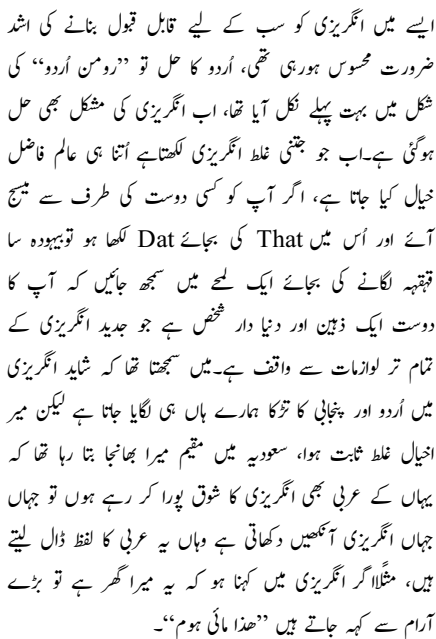
میں اسی لمحے نپولین کے ذاتی محافظ بھی اُسے تلاش

کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے اور دکان میں داخل ہو گئے۔ سمور فروش کو جب اندازہ ہو گیا کہ اُس نے کس عظیم شخصیت کو پناہ دی تھی تو وہ نپولین کی جانب گھوم گیا اور شرمیلے لہجے میں گویا ہوا ”میں اتنے عظیم آدمی سے یہ سوال پوچھنے پر معذرت چاہوں گا! لیکن سمور کے اِس ڈھیر کے نیچے جب آپ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگلا لمحہ یقینی طور پر آپ کی زندگی کا آخری لمحہ بھی ہو سکتا تھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا تھا؟“ نپولین جو اب پوری آن بان کے ساتھ تن کر کھڑا ہو چکا تھا، سمور فروش کے اِس سوال پر غصے میں آگیا اور برہمی سے بولا ”تمہیں مجھ سے، بادشاہ نپولین سے، یہ سوال کرنے کی ہمت کیوں کر ہوئی؟“

پھر وہ اپنے محافظوں سے مخاطب ہوا ”محافظو! اس گستاخ شخص کو باہر لے جاؤ۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اسے گولی مار دو! میں بذات خود اس پر فائر کھولنے کا حکم دوں گا۔“ محافظوں نے اُس بے چارے سمور فروش کو دیوبچ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر اُسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ سمور فروش کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ اُس کے کانوں میں محافظوں کے حرکت کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں جو دھیرے دھیرے ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنی رائفلیں تیار کر رہے تھے۔

ساتھ ہی اُسے سرد ہوا کے جھوکوں اور کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہوا کے تپیرے اُس کے لباس سے ٹکرا رہے تھے اور اُس کے گال بچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کی ناگلیں کپکپا رہی تھیں اور وہ اُن پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تب اُس کے کانوں میں نپولین کی آواز سنائی دی جس نے کھکارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور آہستگی سے بولا ”ہوشیار... شت باندھ لو۔“ اُس لمحے میں یہ جاننے ہوئے کہ اُس کے تمام احساسات و جذبات اُس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں، سمور فروش کے اندر ایک ایسا احساس نمودیر ہونے لگا، جسے بیان کرنے سے وہ قاصر تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔





مصنف: حاجی بصیر سراج

آج سے کچھ سال پہلے تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں فارسی، عربی، پشتو اور اشاروں کی زبان تو سیکھ سکتا ہوں لیکن انگریزی نہیں، لیکن اب جو حالات چل رہے ہیں اُن کو مد نظر رکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یا تو مجھے انگریزی آگئی ہے، یا سب کو بھول گئی ہے۔ کچھ بھی ہو، میری خوشی کی انتہا نہیں، اب سارے سپینگ بدل گئے ہیں اور دو تین لفظوں میں سا گئے ہیں۔ اب Coming لکھنا ہو تو صرف cmg سے کام چل جاتا ہے۔ گرل فرینڈ GF ہو گئی ہے اور فیس بک FB بن گئی ہے۔ اب کوئی انگریزی کا لمبا لفظ لکھنا ہو تو اس سے پہلے کے چند الفاظ لکھ کر ہی ساری بات کہی جاسکتی ہے، میں نے ساڑھے تین سال کی ”فیوشن ہاشٹق“ کے بعد unfortunately کے سپینگ یاد کیے تھے، آج کل صرف Unfort سے کام چل جاتا ہے یعنی جہاں سے مشکل سپینگ شروع وہیں پہ ختم۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو

انگریزی سے نمٹنے کا ایک اور اچھا طریقہ میرے ہمسائے شاکر صاحب نے نکالا ہے، جہاں جہاں انہیں انگریزی نہیں آتی وہاں وہ اطمینان سے اُردو ڈال لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کھانا کھاتے ہوئے انہیں کسی کا بیج آجائے تو جواب میں لکھ بھیجتے ہیں ”پلیز اس ٹائم ٹاٹ ڈسٹرب، آئی ایم کھانا کھاؤنگ“۔ ایک دفعہ موصوف کو فیس بک پر ایک لڑکی پسند آگئی، فوراً لکھا ”آئی وانٹ ٹو شادی ود یو۔۔۔ آر یو راضی؟“۔ لڑکی کا جواب آیا ”ہاں آئی راضی، بس پہلے ٹرائی ٹو راضی میرا بیو تے بے بے“۔ آج کل یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور اکثر اسی انگریزی میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، تاہم اب وہ درمیان میں اُردو کی بجائے پنجابی بولتے ہیں اور ایک جملہ بار باددہراتے ہیں ”آئی سیڈ کھسان نوں کھا، یو سارا خاندان لڑ چول۔“

دنیا مختصر سے مختصر ہوتی جا رہی ہے، کمپیوٹر ڈیسک ٹاپ سے لپ ٹاپ اور اب آئی پیڈ میں سا چکے ہیں، موٹے موٹے ٹی وی اب سمارٹ ایل سی ڈی کی شکل میں آگئے ہیں، ونڈو اسے سی کی جگہ سپلاٹ اسے سی نے لے لی ہے، انٹرنیٹ ایک جھوٹی سی USB میں سمٹ چکا ہے

”شارٹ پیئر“ کی وہ قسم ہے جو کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں نہیں پڑھائی جاتی۔ اس زبان میں خوبیاں تو بہت ہیں لیکن ایک کی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی، یہ جذبات سے عاری زبان ہے، یہ چند لفظوں میں دو ٹوک بات کرنے کی عادی ہے، اس زبان میں کسی کی موت پر v sad لکھ دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے، یہ محبتوں اور احساسات سے محروم زبان ہے۔ میں یہ زبان کچھ کچھ سیکھ چکا ہوں، لیکن استعمال کرنے سے گھبراتا ہوں، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اگر میں نے بھی یہ زبان شروع کر دی تو مجھ میں اور روبوٹ میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

§§§

انوکھی سزا

مصنف: اسد احمد

”حسن بیٹا، دوکان سے ایک کلو چینی جلدی سے لے آؤ،“ حسن کی امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔ حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔



”جی امی! ابھی جاتا ہوں“ حسن نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور موجود دوکان کی طرف چل پڑا، دوکان پر پہنچ کر حسن نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لئے چلا گیا، اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریٹنگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جو رنگ برنگے کیکوں سے بھرا پڑا تھا، حسن اس وقت بھوکا تھا، اسکے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اس نے دوکاندار کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر نگٹے کی کوشش کرنے لگا، اسی دوران دوکاندار واپس آگیا، اور حسن کو چینی دی، حسن نے چینی لے کر رقم ادا کی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ دوکاندار اسکی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور کیک مفت میں اس نے کھا لیا، کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے نگٹے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔

حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، حسن نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے نگٹے میں جھانکنے لگا، کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے نگٹے میں پھنس گئی ہے، اور اب تو درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی حسن آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئیں، اور پوچھا، حسن بیٹا اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا، اور بولا، نہیں امی، بس ویسے ہی کھڑا ہوں۔

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے نگٹے میں ایسا شدید درد ہوا جیسے اسکے نگٹے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو، حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ حسن کی امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کر کے بستر پر لٹایا اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے بیٹا؟

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا، اس کے نگٹے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، اسکے منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا اب حسن کو یقین ہو گیا تھا کہ اسکے نگٹے میں کوئی چیز موجود ہے جسکی وجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حسن کی امی یہ سب دیکھ کر شپٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں، حسن کے ابو، دادا، دادی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور حسن کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

حسن کے دادا نے جلدی سے پانی منگوا یا اور حسن کو بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افادہ نہ ہوا۔ حسن کا درد اور ٹھیس ویسی ہی رہی، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری چھپے وہ کیک کھایا تھا۔

حسن کی دادی اماں نے ایک روٹی کا ٹکڑا منگوا یا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا، حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا، اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا کہ حسن سچ سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہو رہی ہے، حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتادیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے نگٹے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوا یا اور حسن کو اسکے نگٹے کا حکم دیا، حسن نے بہت انکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی، مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگٹے کی کوشش کرنے لگا، حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کر رہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔



حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو نگٹے کی کوشش کر رہا تھا، کہ اچانک اسے زوردار ایکاٹی آئی اور

مسلسل تے شروع ہو گئیں، جیسے ہی تے رکی، حسن کو نگٹے میں کچھ سکون محسوس ہوا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسکے نگٹے میں کوئی چیز نہیں ہے، اب اسے درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ حسن کے ابو اب اس تے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے نگٹے میں پھنس بن کر اسے تکلیف دے رہی تھی۔ اچانک حسن کے ابو کو کسی کالی سی چیز کے ٹکڑے نظر آئے، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چیونٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چیونٹا حسن کے نگٹے میں پھنس گیا تھا، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہو گئی تھی، چیونٹے دیکھ کر اب سب کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ چیونٹا اس کیک پر بیٹھا تھا، وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر نکلنے کی مسلسل کوشش کرنے کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ چھیلنا پڑا۔ حسن کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ وہ سب گھر والوں کے سامنے ندامت کھڑا تھا۔ حسن کے ابو نے حسن کو نگٹے سے لگا لیا اور معاف کر دیا۔ اور وعدہ لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اگلے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو حسن کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ بیٹا یہ پیسے دوکاندار کو دے آؤ۔ یہ اس کیک کے پیسے ہیں جو تم نے کل کھایا تھا، حسن اسی دوکان پر چلا گیا اور دوکاندار سے کہا کہ معذرت اٹکل، کل آپکی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا اور پھر حسن نے جیب سے پیسے نکالے اور دوکاندار کی طرف بڑھا دیئے۔ دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہہ دیا کہ کیک لے لو بیٹا، یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو، حسن نے جیسے ہی کیک دیکھا اسے کل خود کے ساتھ بیٹا ماجرا یاد آگیا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے نگٹے میں پھر سے کوئی چیز پھنس گئی ہو حسن فوراً گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دوکاندار حسن کو یوں بھاگتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے، ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب اسے کیا معلوم کہ حسن کے ساتھ یہ کیک کھانے کی وجہ سے کیا یقینی۔ حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی کیک کھائے گا۔ یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔

تو مجھے یو ہی نہیں رہا "

یہی صورتحال پانامہ لیکس کے حوالے سے بھی درپیش ہے ، طرح طرح کے تبصرے پڑھنے کے بعد بندہ خواہ مخواہ ہی خود کو جج سمجھ بیٹھتا ہے اور ان تبصروں کی روشنی میں فوراً فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ نواز شریف کو عہدہ سے ہٹانے کے علاوہ عمر بھر کیلئے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض تبصرے تو بڑی ہی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر عدالت عظمیٰ کی جیوری وہ پڑھ لے تو ان کی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی ، یقیناً کریں کہ قانون، آئین کی تشریحات جس قدر دلچسپ انداز میں فیس بک پر نظر آتی ہیں اس کا عشر عشر کوئی حقیقی ماہر قانون و آئین نہیں ہو سکتا۔

ایک تبصرہ نگار سے اچھی خاصی سلام دعا ہے، انکے ہر ادبی، سیاسی تبصرہ پر واہ واہ کریوٹوں کی تعداد ہمیشہ سینکڑوں میں ہوتی تھی، ایک دن ہم نے مشورہ دیا کہ "آپ اچھا لکھتے ہیں آپ کی تحریروں، تبصروں میں جامعیت ہوتی ہے لہذا کسی قومی روزنامہ کا قصد کر لیں" انہوں نے بڑے ہی فخریہ انداز میں جواب دیا "انشا اللہ آپ آئندہ چند دنوں میں کسی بڑے قومی اخبار میں میری تحریر پڑھ سکیں گے" کچھ دن انتظار میں گزر گئے پھر پتہ چلا کہ ایک قومی اخبار انچارج ادبی صفحہ نے ان کے تبصرہ پر عجیب سا تبصرہ کیا "کچھ حصہ تو ڈاکٹریونس بٹ کی تخلیقات سے متاثرہ نظر آتا ہے، کچھ جملوں کی کانٹ چھانٹ فلاں فلاں رائٹر کے زیر اثر ہے، بعض پیروں پر فلاں فلاں ادبی لکھاری نے سپیل سے ہی قبضہ بھمایا ہوا ہے اور جملوں کی کاٹ حسن نثار سے مستعار لی گئی ہے" اس تبصرہ نگار کے تبصرہ پر اتنا بھرپور تبصرہ یقیناً بہت ہی دلچسپ تھا کہ اس کے بعد مزید کسی تبصرے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی

§§§

اس کے بعد یقیناً بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ ہمارا ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی بحث مباحثہ کے چکر میں گزر گیا، گو کہ ابتدا میں یہ کام بڑا ہی دلچسپ تھا لیکن بعد میں یوریت ہونے لگی تو ہم نے فیس بک سے جان چھڑا مناسب سمجھی۔ خیر اگلے دن زید نے آن لائن ہوتے ہی پھر کہا کہ "واہ ثقلین بھائی مزہ آگیا آپ نے بکر کو خوب مزہ چکھلایا" ابھی ہم ان کے تعریفی جملوں کا لطف اٹھا رہے تھے کہ بکر صاحب نے آن لائن ہوتے ہی تقریباً ایسے ہی ملتے جلتے میج کئے ، ہم نے دونوں کی تعریفیں دونوں ہاتھوں سے سمیٹیں اور گلے سے لگا لیں۔

صاحبو! سوشل میڈیا پر محض یہ دو ہی ایسے کردار نہیں بلکہ روزانہ ایسے کردار سے واسطہ پڑتا ہے، جن کی فرمائشیں بھی عجیب ہوتی ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے لکھے پر واہ واہ کرنے کے علاوہ چند ایک جملے بھی لکھے جائیں تاکہ ان کی پوسٹ کی گئی "تخلیق نما شے" کی اہمیت و افادیت بڑھ جائے۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیے یہ دیکھئے کہ واہ واہ کی خواہش کسے نہیں ہوتی لیکن سوشل میڈیا خاص طور پر فیس بک کے حوالے سے عجب طرز کی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں اس دنیا کے دانشور جس قدر سچے اور سچے ہیں اسی قدر واہ واہ کریوٹوں کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ پانامہ کیس سے لیکر پی ایس ایل تک ، اگر فیس بکی دانشوروں کے تبصرے پڑھے جائیں تو بندہ خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر اتنی ہی دانش ان افراد میں ہوتی تو قوم کی یہ حالت نہ ہوتی۔ گویا دانش بیچاری بھی دانشوروں کی عقل پر ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ 2013 کے انتخابات کے دوران بھی عالم کچھ ایسا ہی تھا ، طرح طرح کے تبصروں سے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ اب کی بار نہ تو پیپلز پارٹی جیت پائے گی اور نہ ہی مسلم لیگ کے سر کامیابی کا سہرا سجے گا ، عمران خان بھی بس ففٹی ففٹی کامیابی حاصل کریں گے ؟ لیکن اصل کامیابی ہوگی کس کی؟ یہ سوال الیکشن کے نتائج تک احوار ہی رہا لیکن جو نئی انتخابات ہوئے تو پتہ چلا کہ مسلم لیگ ن واضح اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ سوال وہی کہ اگر فیس بک کے دانشوروں کے اٹھائے گئے چاند سورج کے بارے قیاس کیا جائے تو یہی لگتا ہے کہ ابھی دن کو رات اور رات کو دن بھولیں گے۔

ایک ایسے ہی فیس بکی دانشور سے بات چیت ہو رہی تھی فرمانے لگے "پی ایس ایل کی ٹیموں کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کراچی سکنز ، لاہور قلندر جیسی ٹیموں پر خود انہیں بھی اعتبار نہیں، پشاور زلمی ، کونڈ گلیڈی ایٹر کے جیتنے کے بھی امکانات کم ہیں، اسلام آباد یونائیٹڈ بھی گزشتہ برس جیسی مضبوط ٹیم نہیں ہے" اس تبصرہ نگار سے ہم نے پوچھا "پھر کون جیتے گا" یہ سوال پڑھتے ہی انہوں نے فرمایا "اوہ ہ ہو د وہ، یہ

سوشل میڈیا کے دانشور

مصنف: حاجی بصیر سراج

زید سے ہماری سلام دعا یا گپ شپ فیس بک کے ذریعے ہوئی، گپ شپ بھی بذریعہ میج ہوتی رہی ، دوران گپ شپ پتہ چلا کہ یہ صاحب کسی مذہبی جماعت کے کارکن اور ایک بہت بڑے مذہبی رہنما کے ماننے والے ہیں ایک دن انہوں نے ہمیں فیس بک کے ان باکس میں میج کیا کہ "ثقلین بھائی! میری وال پر فلاں صاحب نے میرے قلم کے بارے میں عجیب و غریب جملے لکھ رکھے ہیں، پلیز آپ اسے جواب دیں" ان کی بات نے حیران کر دیا ، ہم نے عرض کی "حضور! دیکھیں ہو سکتا ہے کہ آپ کے قلم کے حوالے سے ہمارے بھی تحفظات ہوں اس لئے آپ براہ کرم ہمیں معاف رکھیں،" زید نے کہا کہ "آپ ایسا کریں میری وال پر آپ ایک دفعہ دیکھ لیں کہ اس نے کیا بکواس کر رکھی ہے، اس کے بعد آپ مجھے اس کا جواب لکھ کر ان باکس کریں" تجویز خاصی معقول تھی اس لئے ہم نے حامی بھری ، اتفاق دیکھئے کہ ان کی وال پر عجیب و غریب تبصرے کریوٹالے صاحب (انہیں آپ بکر سمجھ لیں) بھی ہمارے فیس بکی دوست تھے، بکر کے تبصرہ کو غور سے پڑھا اور پھر اس کا اردو فائنٹ میں جواب لکھ کر زید کو ان باکس کر دیا، دو تین مرتبہ یہ کام کرنے کے بعد اچانک بکر کی طرف سے ان باکس میں میج ملا "ثقلین بھائی! یہ لڑکا زید جو ہے ، اس کی وال پر میری بحث چل رہی ہے اچانک اس نے اتنے دلائل کے ساتھ جواب دینا شروع کر دیا کہ میں حیران ہوں، آپ پلیز میری حملیت میں لکھ دیں کیونکہ آپ نے بھی ایک سے زائد مرتبہ اس کے قلم کے حوالے سے کچھ ایسی ویسی باتیں لکھی تھیں" ہم نے عرض کی "حضور! وہ باتیں اس وقت کے حساب سے تھی ہمارا ان کے قلم سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں اس لئے آپ ہمیں معاف رکھیں" بکر نے منت کے انداز میں کہا کہ "اچھا ایسا کریں آپ جواب لکھ کر مجھے ان باکس کریں میں خود پوسٹ کر دوں گا"



عورت

مصنف: اسد احمد

کی بہنوں بیٹیوں کو اپنی بہن بیٹی سمجھنا شروع کر دیا جس گھر میں بیٹی پیدا ہو جائے بھائی باپ مہذب ہو جاتے ہیں، ماں باپ کہتے ہیں آج سے فحش بات نہیں ہوگی اب ہمارے گھر میں بیٹی آگئی ہے۔ آج بھی جب کوئی بیٹی کسی کو بھائی کہہ کر بلاتی ہے تو لوگ اپنی نظریں احرام میں جھکا لیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی طلاق دینے والے مردوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ایسے لوگوں سے رشتے ناطے تعلقات استوار نہیں کرتے، عورت کے ساتھ زیادتی پر پورا معاشرہ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑتا ہے، ماں بہن بیٹی سے تلخ کلامی پر یا ایک آواز پر مرد اپنے ہی جیسے مردوں کو مار مار کر حالت خراب کر دیتے ہیں۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں دلاوی، نانی، ماں، خالہ کو عقل شعور کی علامت سمجھا جاتا ہے ان کے مشوروں کے سامنے مرد سرگم ہوتے نظر آتے ہیں۔ بیٹی کے رشتے کے مشورے کے وقت برے سے برا آدمی بھی ٹھیک مشورہ دیتا ہے۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر معاشرے میں آج بھی عورت یورپ، امریکہ سے زیادہ محفوظ ہے، اقوام متحدہ کی ایک قرار داد کے مطابق ۸ مارچ کو "خواتین کا عالمی دن" کے طور پر پوری دنیا میں منایا جاتا ہے، یہ قرار دار ۱۹۵۷ء کو منظور کی گئی خواتین نے اپنے حقوق کے لیے ۱۹۰۷ء میں پہلی بار آواز بلند کی اس دن مارچ کی ۸ تاریخ تھی یہ کمزور آواز آگے جاکر توانا ہو گئی پھر اس کی بازگشت اقوام متحدہ میں بھی گونجی اور یوں یہ دن خواتین کا دن قرار پایا۔ یہ تو ہے خواتین کے عالمی دن کا پس منظر لیکن پاکستان کے مغرب نواز دانشوروں اور اہل مغرب کی خدمت میں عرض ہے کہ اسلام اس حوالے سے ثابت شدہ اولیت اور سبقت کا حامل ہے۔ آقا کریم ﷺ نے خطبہ جنتہ الوداع جسے منشور انسانیت کہنا چاہیے میں سرتاج الانبیاء ﷺ نے عورت کی شان اور حقوق کے بارے میں واضح طور پر کہہ دیا تھا سچ تو یہ ہے کہ یورپ افریقہ اور امریکہ میں عورت کی شناخت اور حقوق کے حوالے سے اسلام سے کئی صدیوں بعد آواز اٹھی یورپ میں عورت کے حقوق کی بات کی تاریخ صرف ایک صدی پرانی ہے جبکہ اسلام چودہ صدیاں پہلے عورت کو شناخت احرام اور حقوق دے چکا ہے خطبہ الوداع میں سرور کو مین ﷺ کا ارشاد ملاحظہ ہے۔

”اے لوگو سنو تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اس طرح ان پر بھی تمہارے حقوق، پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جو تمہیں پسند نہ ہو وہ کوئی خیانت نہ کریں اور کھلی بے حیائی کی مرتکب نہ ہوں اور تم انہیں اچھی طرح لباس اور خوراک مہیا کرو، ان کے بارے میں اللہ کا خوف رکھو لحاظ رکھو تم نے انہیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کی اجازت سے وہ تم پر حلال ہیں۔“

اس طرح تاریخ انسانی میں اسلام نے پہلی بار عورت کو مرد کی طرح معاشرے کا کارآمد فرد مانا۔ اس کے مالی مفادات اخلاقی قانونی حقوق کا تحفظ کیا۔



میں خوشگوار حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی نوجوان طالبہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرم و حیا اور اعلیٰ کردار کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی اس کا آہنی عزم مجھے بہت متاثر کر گیا تھا۔ وہ اپنی جوانی کے دور سے گزر رہی تھی جوانی منہ زور ہوتی ہے جوانی میں اپنے خوابوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ جوانی کا منہ زور سیلاب جب چڑھتا ہے تو ماں باپ بہن بھائی بھول جاتے ہیں جوانی میں ہر نوجوان اپنی جوانی اور طوفانی جذباتوں کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن میرے سامنے پنجاب یونیورسٹی کی ماسٹر ڈگری کی طالبہ بیٹھی تھی جو اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی آنے کا مقصد خدا کا قرب اور اللہ کی رضا تھا۔ باتوں باتوں میں جب میں نے پوچھا بیٹی تم شادی اپنی مرضی سے کرو گی یا ماں باپ کی مرضی سے تو وہ اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولی جہاں میرے ماں باپ کریں گے میں وہیں کروں گی۔ میں نے اگلا سوال داغا کیا کوئی لڑکا تمہیں پسند کرتا ہے تو وہ بولی ہاں کرتا ہے لیکن میں شادی اسی صورت میں کروں گی جب میرا باپ خوشی سے اجازت دے گا اور یہی بات میں نے اس لڑکے سے کہہ رکھی ہے کہ اپنا کیریئر بناؤ پھر میرے والد سے میرا ہاتھ مانگو، اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ تم اپنے گھر، میں اپنے گھر، میں نے پوچھا اگر تمہارے والد صاحب نے انکار کر دیا تو وہ پورے عزم سے بولی میرے لیے میرا باپ سب سے اہم اور قیمتی سرمایہ ہے وہ باپ جس نے میرے لیے اپنی جوانی خرچ کر دی دن رات میرے لیے کام کیا میری ننھی سے ننھی خوشی کے لیے اپنی جان لگا دی اس باپ، بھائی اور ماں کے لیے میں ایسی حماقت سوچ بھی نہیں سکتی میرے لیے میرے باپ کی عزت غیرت سب سے اہم ہے۔ باپ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کی قدیلیں روشن ہو گئی تھیں اور میں رشک کر رہا تھا اس باپ ماں بھائی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اسی شرم و حیا والی کردار کا پیکر بیٹی عطا کی تھی۔ لڑکی کچھ دیر میرے پا س بیٹھ کر چلی گئی میں فخر محسوس کر رہا تھا کہ ایسے گوہر نایاب عظیم بیٹیاں صرف عالم اسلام اور پاکستان میں ہی ملتی ہیں۔

میں جب بھی یورپ، یو کے جاتا ہوں تو وہاں جب پاکستانی ماں باپ کی بچیوں کو مغربی رنگ میں رنگے دیکھتا ہوں تو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ہم پاکستانی کتنے مقدر والے ہیں جہاں بیٹیاں بہنیں بھائیوں اور باپ کی غیرت کے لیے پتہ ہی نہیں چلتا کب جوانی سے بڑھاپے کی وادی میں آتے جاتی ہیں پاکستانی ماں باپ شرم و حیا کے پیکر ان بیٹیوں سے سرفراز ہیں۔ کچھ لوگ یہ نہیں جانتے کہ پاکستان کی ماؤں عورت جو مغرب نوازی کی جگالی کرتی نظر آتی ہے وہ یہ بھول جاتی ہے کہ بلاشبہ مردوں کی برتری کے اس معاشرے میں عورت اپنے اصل مقام اور حقوق سے پوری طرح فیض یاب نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود عورت کو جو مقام یہاں حاصل ہے یورپ یو کے اور امریکہ کی عورتیں اس عزت اور مقام کی خوشبو سے بھی محروم ہیں پاکستان کی اکثریت آج بھی دیہات میں رہتی ہے آپ کسی بھی گاؤں چلے جائیں عورت کو دیکھ کر لوگ راستہ بدل لیتے ہیں۔ نظریں نیچی کر لیتے ہیں۔ رشکوں بسوں ٹہینوں میں ان کے لیے سیٹوں سے اٹھ جاتے ہیں بہن بیٹی ماں جی کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں سگریٹ نوشی نہیں کرتے، بلند آواز سے بات نہیں کرتے اگر مرد گھبرا جائیں تو کسی عورت کے آنے سے خاموش اور مہذب ہو جاتے ہیں، آپ نے اکثر مردوں کے منہ سے ایک فقرہ سنا ہوگا کہ میں بھی بہنوں کا بھائی ہوں میں بھی بیٹی کا باپ ہوں بہنوں بیٹیوں والا ہوں، جس گھر میں بیٹی پیدا ہوگئی تو لوگوں نے شراب نوشی ترک کر دی۔ برائی کے سارے کام چھوڑ دیے دوسروں

